انجمن ترقی اردو ہند
کا
ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

ایڈیٹر :- آل احمد سرور

قیمت سالانہ
تین روپیہ
ایک پرچہ
ڈیڑھ آنہ
تاریخ اشاعت
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

رجسٹرڈ نمبر
اے ۹۲۲
ٹیلیفون نمبر ۲۹
تار کا پتہ
"انجمن"
علی گڑھ

جلد ۱۵ | علیگڑھ - ۲۲ دسمبر ۱۹۵۶ع | شمارہ ۲۶

رفتارِ ادب

خلیل الرحمٰن اعظمی

پچھلی بیٹھک میں بات یہاں تک پہنچی تھی کہ اردو شاعروں کی ایک نئی نسل کچھ تازہ امکانات لے کر آئی ہے۔ یہ بات ممکن ہے بعض پختہ کار شاعروں کو بُری لگی ہو کیونکہ میں نے ۱۹۳۶ء والی نسل کے اکثر شاعروں کو یہ کہتے سنا ہے کہ صاحب نئی پود میں کوئی ایسا شاعر نظر نہیں آتا جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرے۔ بعض حضرات تو یہاں تک کہتے ہوئے سنے گئے ہیں کہ نوجوان شاعروں میں سے ابھی تک کسی نے ایک مصرعہ بھی ایسا نہیں کہا ہے جو قابلِ ذکر ہو۔ پرانی نسل کے اس رویے سے کئی دلچسپ نتائج نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ لوگ ہر شاعری کو اپنی شاعری کے پیمانے سے ناپتے ہیں یعنی اگر نئے شاعروں کے یہاں کچھ ایسے عناصر ہیں جو بالکل نئے ہیں اور پچھلی نسل کے شعراء کا کلام ان سے خالی ہے تو یہ چیز ان کے نزدیک سرے سے "غیر شاعرانہ عنصر" ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ۱۹۳۶ء والی نسل کے اکثر شعرا ایسی حقیقتیں لے کر آئے تھے جو پندرہ بیس سال کے عرصے میں ہی اپنی تقدیر پوری کر چکیں۔ ان میں وہ نامیاتی کیفیت نہیں ہے کہ نئے امکانات کو قبول کر کے اپنی شخصیت کو از سرِ نو تعمیر کر سکیں۔ اس سے پہلے کہ میں ان نئے امکانات کو اجاگر کروں کچھ نام سن لیجئے۔ مختار صدیقی، ضیا جالندھری، ڈاکٹر مسعود حسین، ابنِ انشا، ناصر کاظمی اور بلراج کومل۔ یہ وہ شعرا ہیں جن کے مجموعے حال ہی میں چھپے ہیں۔ کچھ شاعر ایسے ہیں جن کا کلام ابھی یکجائی شکل میں نہیں آیا ہے۔ جیسے جعفر طاہر، شاذ تمکنت، عبدالعزیز خالد، رضی ترمذی وغیرہ۔ ان سارے نئے شعراء کا کلام پورے تنقیدی شعور کے ساتھ اگر کسی نے پڑھا ہے تو وہ ایک باتیں بہت واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ ان کی سب سے پہلی خصوصیت اس نسل کی یہ ہے کہ ان میں سے اکثر شعراء کے یہاں وہ "ہندستانی مزاج" ملتا ہے جو ۱۹۳۶ء والی نسل کے بہترین شعراء کے یہاں بھی نہیں ہے، مجاز، جذبی، راشد اور فیض اس دور کے چند بہترین شاعروں میں سے ہیں لیکن ان کا کلام جن لوگوں نے بھی پڑھا ہے ان کو اندازہ ہوگا کہ ان سب شعراء کی لے "عجمی" ہے جس سے اب تک اردو شاعری مانوس تھی۔ مجاز اور جذبی کے یہاں تو نظموں میں بھی غزل کی لے کا وفور ہے اور موضوعات و مسائل کے نئے پن اور احساسات کی تازہ کاری کے باوجود ان کی لے اور ان کی شاعری کا مزاج اردو غزل کا مزاج ہے۔ راشد اور فیض نے ہیئت کے سلسلے میں جدید انگریزی شاعری سے استفادہ کیا اور بعض نئے رموز و علائم کو جگہ دی جس کی وجہ سے ان کے یہاں تازگی و ندرت ملتی ہے لیکن ان کا ڈکشن، ان کا مجموعی آہنگ اور ان کی شاعری کا مزاج بھی وہی ہے۔ سردار جعفری، کیفی اعظمی وغیرہ نے اگرچہ زیادہ تر نظمیں ہندستان کی آزادی اور سیاسی مسائل پر لکھیں ان کے یہاں بھی جوش اور ظفر علی خاں کی طرح کا لب و لہجہ ہے جس میں ہندستانی دھن نہیں۔

آزادی سے قبل ہندستان جس سیاسی کشمکش کے دور سے گزر رہا تھا اس وقت ہمارے شاعروں کے لئے یہ ممکن بھی نہیں تھا کہ وہ فنِ شعر کے سلسلے میں کوئی دور رس قدم اٹھا سکیں۔ اس وقت ہمارے شعراء کے سامنے داخلی اور خارجی جتنے بھی مسائل تھے ان کے پیچھے ہی اعصابی تشنج ایک فطری امر تھا۔ لیکن آزادی کے بعد ایک طرف تو وہ طوفان ٹھہر گیا دوسرے پوری قوم اپنی نشاۃِ ثانیہ کے لئے اپنے ہزاروں برس کے تہذیبی سرمائے کا جائزہ لینے لگی اور سارے تہذیبی عناصر جو اب تک تاریکی میں تھے، انہیں دن کی روشنی دیکھنے کو مل گئی۔ اس تبدیلی کا اثر ہمارے

شاعروں کے لب و لہجہ اور ان کے طرزِ فکر پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان شعراء کے یہاں ہندوستان کی مٹی کی خوشبو اور یہاں کا رس، ہندوستان کی دیومالا، رقص، موسیقی اور لب و لہجے کی وہ روایتیں ملتی ہیں جو مانوسیت، تہ داری اور گمبھیرتا کے لئے اپنے سامنے تلسی داس، رحیم، رس خان، کبیر، میرا بائی اور ٹیگور کی مثال بھی رکھتی ہے۔ پھر اردو نے اپنی صدیوں کی تاریخ میں اس آواز کو جس طرح نکھارا اور سنوارا ہے اور ہمارے پچھلے شاعروں نے جدت اور ندرت کے جو جو نمونے چھوڑے ہیں ان سب کے اثر اور امتزاج سے مجموعی طور پر نئی نسل کے شاعروں کا جو مزاج بنا ہے وہ بڑا دلکش ہے۔ یہ اردو شاعری کے لئے ایک نیا شگون ہے اور اسے زمین سے قریب لانے کے لئے ایک صحت مند قدم۔ پچھلے دور میں انفرادی طور پر نظیر اکبرآبادی، میر تقی میر، عظمت اللہ خاں، مقبول حسین احمد پوری، میراجی، شاد عارفی اور فراق وغیرہ نے اردو شاعری میں ہندوستانی کلچر اور ہندوستانی مزاج کو سمونے کی جو کوششیں مختلف اوقات میں کی تھیں ان کے پھلنے پھولنے کا وقت صحیح معنوں میں اب آیا ہے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ نئے شاعروں کے یہاں فطری طور پر یہ رجحان ابھر رہا ہے۔ مختار صدیقی اور ڈاکٹر مسعود حسین کے یہاں ۱۹۴۷ء سے قبل یہ رجحان انفرادی صورت میں آہستہ آہستہ پروان چڑھ رہا تھا اس کی وجہ غالباً مختار صدیقی کی کلاسیکل ہندوستانی سنگیت سے مناسبت اور ڈاکٹر مسعود حسین کی ہندی اور بنگالی ادب سے گہری واقفیت ہے لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد ان شعراء کو اپنے مزاج کے موافق فضا ملی اور اسی دور میں ان کے کلام کا اعتراف کیا گیا۔ اس اعتبار سے ان کے مجموعے تازہ ترین تحفے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مختار صدیقی کی تمام نظموں کا لب و لہجہ اسی خصوصیت کا حامل ہے لیکن ان کی طویل نظم "موہنجوداڑو" جو ۱۹۵۰ء میں لکھی گئی خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے اور اس رجحان کی کامیاب ترین مثال ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر مسعود حسین کے گیتوں کے علاوہ ان کی طویل نظم "روپ بنگال" اس دور کی خاص نظم ہے۔ ابن انشا اور ناصر کاظمی کے یہاں بھی ہندوستانی مزاج اور ہندوستانی لے ہے۔ میر تقی میر کی طرف ان دونوں شعرا کا میلان ان کی "غم زدگی" کی بنا پر نہیں ہے (جیسا کہ بعض تبصرہ نگاروں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا) بلکہ یہ اسی نئے لہجے کی تخلیق کے سلسلے میں ایک کوشش ہے۔ اردو غزل میں میر ہی ایک ایسے شاعر ہیں جو ہندوستانی لب و لہجہ رکھتے ہیں اس لئے نئی نسل ان سے متاثر ہے تو یہ اس کے تنقیدی شعور کی دلیل ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس نسل کے کئی شاعر پاکستان میں ہونے کے باوجود مزاج کے اعتبار سے خاص ہندوستانی ہیں۔

نئی نسل کا دوسرا اہم رجحان طویل نظموں، ڈرامائی نظموں اور لمبی نظموں کا ہے۔ اس قسم کی شاعری کے لئے جذباتیت، ابال اور شدید داخلیت کے بجائے ضبط و توازن، فکری اور فلسفیانہ پس منظر اور قوت تعمیر کی ضرورت ہے۔ پچھلی نسل کے بعض بہترین شاعر مختصر نظم کے شاعر ہیں جیسے فیض، مجاز، جذبی وغیرہ۔ بعض دوسرے صف کے شعراء نے طویل نظمیں لکھنے کی کوشش کی لیکن یہ لوگ طویل نظم شاید اس نظم کو کہتے تھے جو دیکھنے میں طویل نظر آئے۔ یعنی کسی طرح کھینچ تان کر مصرعوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے اس لئے ان نظموں میں ایک آدھ بند تو کام کے نکل سکے باقی نظم سپاٹ ہو کر رہ گئی۔

نئی نسل کے شاعروں نے کامیاب طویل نظمیں لکھی ہیں جن میں ابن انشا کی "بغداد کی ایک رات"، "اس کا آخری دن"، "شنگھائی"، "اُفتاد" اور "مضافات"، جعفر طاہر کی "چہار درویش"، شاذ تمکنت کی "میری زندگی میرا فن" اور "تند و کن"، عبدالعزیز خالد کی "ماتم یک شہزادہ"، ضیا جالندھری کی "سالی" اور رضی ترمذی کی ڈرامائی نظمیں خاص طور پر اہم ہیں۔ ان نظموں کے مطالعہ کے بعد ایک اور بات سمجھ میں آتی ہے کہ پچھلی نسل کے شاعروں کی طرح ہمارے نئے شاعروں نے کسی ایک موضوع ہی کو اپنا بت نہیں بنایا ہے بلکہ زندگی کی مختلف سمتوں میں جا کر اس کی وسعتوں کو پانے کی کوشش کی ہے اس لئے ان کے یہاں یک رنگی یا یکسرے پن کا عیب بھی نہیں۔ تنوع، رنگا رنگی اور بوقلمونی جو ہر زندہ ادب کی پہچان ہے اس طرف اب ہمارے شاعر راغب ہو رہے ہیں۔ اس پر بھی اگر کسی کو نوجوان شاعروں کا ایک مصرع نہیں بھاتا تو ان سے سوائے اس کے اور کیا کہا جاتا ہے کہ ؎

ہمارا کارواں جاتا رہے تو بھی سوتا ہے
بہت ڈرتا ہوں میں اے میر تیری دیر خوابی سے

ہماری زبان

۲۲- دسمبر ۱۹۵۶ء

سوچنے کی بات

ہمارے بعض معاصرین کو ہمارے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ اردو کے لئے فضا سازگار ہوتی جا رہی ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ ہم خوش فہمی کا شکار ہیں اور یوپی کی حکومت کے رویے پر غور نہیں کرتے اور ہمدردی کے وعدوں پر ہی مطمئن ہو جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ انھوں نے ہمارے پچھلے اداریوں کو غور سے نہیں پڑھا ورنہ شاید انھیں ہمارے نقطۂ نظر کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہوتی۔

حکومت یوپی کے رویے کے متعلق ہم کسی خوش فہمی کے شکار نہیں ہیں۔ ہمیں اس کا تکلیف دہ احساس ہے کہ آج بھی یہ حکومت اردو کے ساتھ انصاف پر آمادہ نہیں ہوئی ہے اور اس پر نہ جواہر لال نہرو کے بار بار توجہ دلانے کا اثر ہے، نہ اردو بولنے والوں کی متفقہ آواز کا، نہ جمہوریت اور عدل کے تقاضوں کا۔ ہم سے جو ہمدردی کے وعدے کئے جاتے ہیں، ہم ان سے مطمئن نہیں ہیں، ان وعدوں کے عملی جامہ پہننے کا ہمیں بے چینی سے انتظار ہے۔ ہم سادہ لوح نہیں ہیں جو ان خشک تسلیوں سے بہل جائیں۔ ہاں ہمیں اپنے ملک پر، اپنے جمہوری نصب العین پر، اس ملک کی اکثریت پر جو آج تک غلط سیاست کا شکار ہے، اپنی زبان پر اور خود اپنے خلوص اور عقیدے پر اعتماد ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یوپی میں آج سمپورنانند جی کی حکومت ہے۔ لیکن یوپی صرف سمپورنانند جی کا نہیں ہمارا بھی ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی اقلیت کو اگر پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے تو نہ صرف اس اقلیت کا بلکہ پورے ملک کا نقصان ہوتا ہے اس کے باوجود ہم یہ کہنے پر مصر ہیں کہ اردو کے لئے فضا سازگار ہوتی جا رہی ہے۔ آج سے کچھ سال پہلے اردو والوں کی آواز کو اتنی توجہ سے نہیں سنا جاتا تھا۔ ملک کے مختلف سیاسی اور علمی حلقوں میں اردو کے اتنے ہمدرد نہ تھے۔ اردو ادب سے دلچسپی اتنی عام نہ تھی۔ آج اردو والوں کی حمایت میں ہر پارٹی کے انصاف پسند لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ سب ریاستی حکومتوں کا رویہ یوپی کی حکومت کا سا نہیں ہے۔ مثلاً آندھرا پردیش کی حکومت نے اردو کے تحفظ اور بقا کے لئے جو انتظامات شروع کئے ہیں وہ قابل مبارکباد ہیں۔ فضا بہتر ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم مطمئن ہیں یا ہمیں کچھ کرنا نہیں ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ آج ہماری آواز زیادہ سنی جاتی ہے اور باوجود دشواریوں کے ہمارے مقاصد کے پورے ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔ جو لوگ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ حکومت یوپی ٹس سے مس نہیں ہوتی، ان سے ہم یہ گزارش کریں گے کہ تنگ نظری اور تعصب کے بادل اتنی جلد غائب نہیں ہوتے اس کے لئے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے جدوجہد صرف ہنگامہ کرنے، جلوس نکالنے، جلسے کرنے اور قرار دادیں پاس کرنے کا نام نہیں ہے۔ اس کے لئے لوگوں کی ذہنیت بدلنے کا پروگرام بنانا ہے۔ سیدھا سادا سوال یہ ہے کہ اردو والے اس بدلتے ہوئے ہندوستان کے لئے کس طرح مفید ہو سکتے ہیں اس کی ترقی میں کیا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ اس کے معیار زندگی، قومی دولت، صنعتی ترقی میں کیا اضافہ کر سکتے ہیں، اگر کر سکتے ہیں تو ہندوستان میں اردو والوں کے ساتھ انصاف اب نہیں نیاز مندی سے کام لینا ہوگا۔ اگر نہیں کر سکتے تو ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوگی۔ مانگنے کا حق انھیں کو ہے جو کچھ دے بھی سکتے ہوں۔

بہت سے اردو دوست سمجھتے ہیں کہ حکومتوں کے قوانین سب کچھ ہیں۔ یہ بڑی سادہ لوحی کی بات ہے۔ قوانین کے پیچھے ایک طاقت ہوتی ہے۔ یہ طاقت اگر جمہوریت کے دور میں اکثریت کے جذبات سے ہم آہنگ نہ ہو تو قوانین دھرے رہ جاتے ہیں۔ اردو کے لئے اگر حکومت بہتر سے بہتر قوانین بنا بھی دے تو اگر ملک کی اکثریت انھیں اپنانے پر تیار نہ ہو تو یہ قوانین دستاویزی کاغذ بن کر رہ جائیں گے اس لئے حکومت کو اس کا فرض تو یاد دلانا ہے کیونکہ یہ ہمارا جمہوری حق ہے۔ مگر اس سے بڑا فرض یہ ہے کہ حکومت کے پیچھے جو اکثریت کے ذہن کی طاقت ہے اسے متاثر کیا جائے۔ خوش قسمتی سے یہ کام ہمارا ادب کر سکتا ہے۔ اس ادب کی قدر کرنے والے، اس کی حفاظت کرنے والے، اس سے محبت رکھنے والے خاصی تعداد میں ہیں مگر یہ تعداد ابھی کافی نہیں۔ ہمیں اس تعداد کو بڑھانا ہے۔ اپنے کلاسیکل ادب کو عام کرنا ہے۔ اچھا اور عام فہم ادب پیدا کرنا ہے۔ اپنے ادب کو دوسروں کے رسم الخط میں بھی ان تک پہنچانا ہے۔ ہمیں ہندوستان کی ترقی اور خوشحالی کے مبارک مشن میں تن من دھن سے شریک ہونا ہے۔ اس خدمت کے نتائج ضرور نکلیں گے ایک طرف اردو زبان و ادب کی حفاظت حکومت خود کرنے پر مجبور ہوگی دوسری طرف اردو زبان و ادب کے اچھے عناصر ہندی اور دوسری قومی زبانوں پر گہرا اثر ڈالیں گے۔ یہ زمانہ گھبرانے اور جلی کٹی سنانے کا نہیں یقین محکم اور عمل پیہم کا ہے۔ ہماری منزل ابھی بہت دور ہے اس لئے اگر ہم ہمت ہار گئے یا غم و غصے کا شکار ہوگئے یا مایوسی نے ہمیں گھیر لیا تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ ہمیں تو ہر حال میں اپنی

جدوجہد جاری رکھنا ہے۔ جب تک ہم زندہ ہیں اپنے زبان و ادب کے لئے ہر مشکل کا مقابلہ کرنا ہے ملک میں سچی جمہوریت قائم ہو جائے گی تو ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔ مگر یہ جمہوریت اسی وقت قائم ہوگی جب ہمارا عمل بھی اس کے مطابق ہوگا۔ جب ہم اپنی تنگ نظری کو بھی نکال پھینکیں گے اور خوش دلی اور لطف کے ساتھ سارے عناصر سے مل کر ملک کی نجات و بہبود کے لئے سرگرم عمل ہوں گے۔

ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس

ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس نئی دہلی وگیان بھون میں اتوار ۲۳ دسمبر سے شروع ہو رہی ہے۔ ۲۰ ملکوں کو دعوت دی گئی تھی جن میں سے ۱۳ ملکوں کی شرکت کی توقع ہے سات ملکوں کے ڈیلیگیشن آ چکے ہیں۔ ہمارے پڑوسی ملک پاکستان کے ڈیلیگیشن میں جناب عبدالمجید سالک، غلام مصطفیٰ تبسم، فیض احمد فیض، امتیاز علی تاج، شوکت تھانوی، عبادت بریلوی، اشفاق احمد، مرزا ادیب، قتیل شفائی وغیرہ کے تشریف لانے کی امید ہے۔

اتوار ۲۳ دسمبر کو صبح ۹ بجے افتتاحی اجلاس ہوگا۔ ۱۱ بجے کھلا اجلاس ہوگا۔ شام کو ۵ بجے دلی میونسپلٹی کی طرف سے خیر مقدم کیا جائے گا۔ اور چار روز تک کھلا اجلاس جاری رہے گا۔

۲۴ دسمبر کو ۹ بجے استقبالیہ کمیٹی کی طرف سے کلچرل شو ہوگا ۲۵ کو شام ۵ بجے پنجابی کلا کیندر کی جانب سے سواگت ہوگا۔ ۲۶ دسمبر کو ۹ بجے انٹرنیشنل مشاعرہ ہوگا۔ ۲۷ دسمبر کی شام کو ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے خوش آمدید کی تقریب ادا ہوگی۔ ۲۸ دسمبر کو دنیا کے ادیبوں کی گول میز کانفرنس ہوگی۔

ایشیائی کانفرنس کے انتظامات بہت پہلے سے جاری تھے۔ ہندوستان کے سرکردہ لوگوں کی ایک اسٹینڈنگ کمیٹی بنا دی گئی تھی جس نے کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے بڑی سرگرمی سے کام کیا اور کانفرنس کے انتظامات بھی ٹھیک ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کانفرنس بہت کامیاب رہے گی۔ اس کانفرنس میں چین، ایران، کوریا، مصر، نیپال، منگولیا، روس، پاکستان، انڈونیشیا، ویٹ نام، برما، فلپائن، سیلون وغیرہ شریک ہو رہے ہیں۔

انجمن کی خبریں

امروہہ (یوپی) ـــــ مقامی انجمن ترقی اردو کی نگرانی میں تعلیم بالغان کا دوسرا اسکول محلہ چاہ شور میں بر مکان جناب قاری سبط رسول صاحب جاری ہوا۔ رسم افتتاح کے موقع پر حامیان اردو کے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے صدر انجمن جناب حکیم کلب علی صاحب شاہد نے اسکول کی افادیت اور حیات الشد طریق تعلیم کے ساتھ تعاون کرنے کی اپیل کی واضح رہے کہ امروہہ میں انجمن کے زیر اہتمام یہ دوسرا اسکول ہے۔ یہاں شب میں اردو کی تعلیم بالکل مفت دی جاتی ہے اور پڑھنے لکھنے کے جملہ مصارف انجمن کی جانب سے ادا کئے جاتے ہیں۔

ناگور (راجستھان) ـــــ حافظ عبدالقیوم صاحب نوری جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو اطلاع دیتے ہیں:۔

یہاں عرس حضرت صوفی حمیدالدین صاحبؒ ناگوری کے موقع پر جو ۲ دسمبر ۱۹۵۶ء سے ۷ دسمبر ۵۶ء تک بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ میلہ میدان میں انجمن ترقی اردو ناگور نے اپنا کیمپ لگایا اور جہاں ۶ دسمبر کی شب کے ۹ بجے ایک طرحی اور ۷ دسمبر ۵۶ء کے دن میں غیر طرحی بزم مشاعرہ زیر صدارت راجستھان کے مشہور کہنہ مشق صاحب دیوان شاعر حضرت بیدل بیکانیری (سابق ڈی بیکانیر اسٹیٹ) منعقد ہوئی جس میں مقامی و بیرونی تقریباً بیس شعراء کرام نے شرکت فرما کر اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ دن کی بزم میں کلکٹر صاحب ضلع ناگور، چیرمین میونسپل بورڈ ناگور، ایس ڈی ایم، اکسٹرا مجسٹریٹ، ضلع پنچایت افسر وکیل سوشل ویلفیئر و دیگر افسران شریک ہوئے۔ صاحب صدر نے ضعیف العمری کے باوجود ہر دو مجلس میں غیر طرحی کلام پیش کیا جو بیحد پسند کیا گیا۔ نیز کلکٹر ضلع ناگور نے خواہش ظاہر کی کہ ان دونوں غزلوں کی نقل مجھے دی جائے۔ انجمن نے انہیں جلد بھجوانے کا انتظام کیا کیونکہ صاحب موصوف کا یہاں سے تبادلہ ہو گیا ہے۔

جے پور (راجستھان) ـــــ راجستھان کے متعدد ایم۔ ایل۔ اے صاحبان نے کارکنان انجمن ترقی اردو راجستھان جے پور سے تبادلہ خیالات کرکے اردو کی تعلیم پر کافی دلچسپی سے غور کے بعد فیصلہ کیا کہ وہ جلد تر شروع کرائی جائے اور کل راجستھان اردو کنونشن کے منظور کردہ مطالبات کی منظوری گورنمنٹ راجستھان سے لی جائے۔ چنانچہ ایک وفد نے جو ایم۔ ایل۔ اے صاحبان اور کارکنان انجمن پر مشتمل تھا۔ ایجوکیشن سکریٹری راجستھان سے وقت ملاقات طلب کیا۔ تو جواب ملا کہ سکریٹری صاحب اردو کی تعلیم جاری کرنے کا حکم عام کل تک جاری کر رہے ہیں جملہ مراحل طے ہو چکے ہیں۔ اس لئے وفد کی ملاقات ملتوی رہی اور امید ہے کہ عنقریب اردو کی تعلیم کا انتظام ہو جائے گا اس وقت صرف شہر جے پور کے ۱۷ اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

اردو رسم خط

(۲)

از جناب سجاد مرزا صاحب حیدرآباد
محقق: جناب ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب •

سوال نمبر ۲

ہاتھ سے لکھائی اور ٹائپ سے چھپائی کے لئے الگ الگ رسم خط ضروری ہے۔ نستعلیق اردو سے وابستہ ہو چکا ہے اور مروج ہے لیکن نستعلیق کا ٹائپ جو باکفایت اور کارآمد ہو ہرگز نہیں بن سکتا اس لئے ٹائپ کی چھپائی کے لئے نسخ یا نسخ سے ملتا جلتا رسم خط اختیار کرنا ہوگا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو میرا کتابچہ "اردو رسم خط" مطبوعہ ۱۹۴۰ء اس اثنا میں میری تجاویز کے مطابق ٹائپ تیار کرلیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو شکستہ و بنیادی ٹائپ۔ اس ٹائپ فونٹ (Font) میں کل (۱۱۲) جز اور حرف اعراب اوقاف چند سے ہیں۔ یہ اقل ترین تعداد ہے۔ کم ناممکن ہے۔

سوال نمبر ۳

اردو ابجد کی موجودہ ترتیب برقرار رکھی جاسکتی ہے لیکن حروف کے ناموں کے بجائے ان کی آوازیں سکھائی جائیں۔ لکھائی سے پڑھائی آسان ہوجاتی ہے۔ اردو رسم خط ایک قسم کی مختصر نویسی ہے اس کی مناسبت سے صوری ترتیب موزوں ہے۔

سوال نمبر ۴

مختصر نویسی اور زود نویسی اردو لکھائی کی خصوصیات ہے ان کو برقرار رکھنا اردو کے حق میں مفید ہوگا۔ ابتدائی اور مکمل شکلیں ایسے رسم خط کے لئے موزوں ہیں جس میں حروف مرکبات میں بھی اپنی اصل شکل بالعموم نہیں بدلتے۔

سوال نمبر ۵

اردو میں حروف علت نہیں ہیں۔ اس لئے اعراب کا استعمال ضروری ہے اور اس کے استعمال میں کوئی پیچیدگی نہ کہ سہولت کا باعث ہوگی۔

سوال نمبر ۶

ہمزہ کو اعراب میں شامل کردیا جائے تو مناسب ہوگا۔ ابجد میں اس کا مقام نہیں ہے۔ انجمن ترقی اردو نے ہمزہ کی کتابت کے لئے حیدرآباد کی اردو ریڈروں کے لئے جو عمل کیا تھا اس کی تحقیق کی جائے۔

سوال نمبر ۷

ذال، ز کو مخصوص لکھنا غلط ہوگا [illegible] مناسب ہے

سوال نمبر ۸

جو آواز حروف جز اردو زبان میں ان کو اردو رسم خط میں ترک نہیں کیا جاسکتا۔ اردو اب مستقل زبان کا درجہ حاصل کرنے کے بعد انٹرنیشنل حیثیت رکھتی ہے۔ اس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا الفاظ یا اشعار میں تاریخ نکالنا ایک صنعت ہے اور مایہ امتیاز

سوال نمبر ۹

مخلوط آوازوں کے لئے الگ حروف بے ضرورت ہیں۔

سوال نمبر ۱۰

اردو رسم خط میں تین شکلیں ہیں۔ ابتدائی۔ درمیانی۔ آخری۔ اصل پیچیدگی رسم خط میں کرسیوں کی وجہ سے ہے۔ میں نے اپنے ٹائپ میں ب کو درمیانی شکل اور ابتدائی شکل ایک رکھ کر تجربہ کیا لیکن معلوم ہوا کہ درمیانی اور مروجہ شکل سے تلفظ پڑھنے میں سہولت ہے اور ایک درمیانی جوڑ کا اضافہ جب کہ کرسیوں میں کمی کردی گئی ہو باعث زحمت ہے اور نہ اس سے کچھ خاص کفایت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ لکھنے میں ب کی ابتدائی شکل اگر درمیانی شکل کے لئے استعمال کی جائے تو یہ عمل مختصر نویسی اور زود نویسی کے منافی ہوگا۔

سوال نمبر ۱۱

بیرونی زبان کے ایسے الفاظ جو قطعی طور پر زبانوں میں شامل ہوگئے ہیں ان کو ہجائی طریقہ پر لکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ ایسا کرنا یہ ثابت کریگا کہ ایسے الفاظ غیر ہیں۔ یونیورسٹی۔ ٹرنک۔ پارلیمنٹ اردو میں شامل ہوچکے ہیں اور ان کا تلفظ بھی انگریزی نہیں رہا ہے۔ عربی اور فارسی میں بھی یونانی کے الفاظ کے لئے جو قبول کر لئے گئے ہیں۔ ہجائی طریقہ استعمال نہیں ہوتا۔

سوال نمبر ۱۲

یا مثل سابقہ اور تلفظ کے ساتھ اسی وقت لکھے جاتے ہیں جب کہ صحیح تلفظ ادا ہو مثلاً [illegible] زود نویسی کے پیش نظر نشان [illegible] لکھنا مناسب ہوگا خصوصاً جب کہ [illegible] لکھنے سے تلفظ ہی صحیح ادا ہوتا ہے

سوال نمبر ۱۳ عربی فارسی کے ایسے الفاظ جو ہندی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں مثلاً مرہٹی، بنگالی میں شامل ہوگئے ہیں ان کو اردو تلفظ کے مطابق لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں [illegible] آسان ہو۔ جو الفاظ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں شامل نہیں ہوئے اور نہ ان کی توقع ہو ان کو اصل فارسی زبان کے مطابق لکھنا مناسب ہوگا۔ ایسے الفاظ کو [illegible] مثلاً [illegible]

[illegible]

سوال نمبر ۱۴ [illegible] رسم خط سے نہیں بلکہ [illegible] سے متعلق ہے [illegible] رسم خط چھپا [illegible]

(باقی آئندہ)

آخری ملاقات

ہفتہ وار "اقدام" لاہور نے م، ش کے قلم سے "لاہور کی ڈائری" کے عنوان سے مولانا ظفر علی خاں کی ملاقات کا حال شائع کیا ہے۔ ہم معہ موصوف کے شکریہ کے ساتھ آخری ملاقات کا ٹکڑا یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

حضرت مولانا سے میری آخری ملاقات گزشتہ گرمیوں میں مری میں ہوئی۔ مولانا ان دنوں پوسٹ آفس کے نزدیک ایک کوٹھی "دلکشا" میں مقیم تھے۔ میں ایک شام سنٹرل ہوٹل سے چل کر سیدھا مولانا کی کوٹھی پر پہنچا۔ اس وقت مولانا کوٹھی کے صحن میں ایک کرسی پر تن تنہا بیٹھے تھے۔ میں تمہید اور تکلف کے بغیر ان کے ساتھ والی پر جا کر بیٹھ گیا اور حضرت مولانا سے اپنا تعارف خود ہی کر ڈالا۔ ایسے جیسے کوئی خواب سے چونکتا ہے۔ یا جس طرح ذہن میں ایک بھولی بسری یاد تازہ ہو جاتی ہے حضرت مولانا نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور پوچھا کہئے "آپ کیسے ہیں؟"

میں نے جواب میں مولانا سے ان کی صحت کے بارے میں پوچھا تو فرمانے لگے "اچھا ہوں"۔ میں نے مولانا کو "بک اپ" کرنے کے لئے ماضی کے واقعات کو ان کے سامنے دہرانا شروع کیا اور اس زمانے کی یاد تازہ کرنے کی کوشش کی جب پروفیسر محمد سرور کی ادارت کے زمانے میں بھی زمیندار کے ضمانت طلب تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا کی طبیعت جولانیوں پر تھی۔ اور ہر چھٹے مہینے "زمیندار" کی ضمانت ضبط کر لی جاتی تھی۔ حضرت مولانا کے سامنے میں نے اس دور کے کئی لطیفے دہرائے جنہیں سن کر ان کی طبیعت گویا بشاش ہو گئی۔

میرے ہنسنے کی آواز سن کر مولانا کے چھوٹے بھائی چودھری غلام حیدر خاں (جو حضرت مولانا کی تنہائی کے واحد رفیق تھے) کوٹھی سے باہر تشریف لے آئے اور ہماری گفتگو میں شریک ہو گئے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ آج بہت دنوں کے بعد مولانا کی طبیعت بشاشت کی طرف مائل ہے۔ باورچی خانے کے باہر بیٹھے ہوئے خانساماں نے بھی چودھری صاحب کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ مولانا آج بہت عرصے کے بعد کھلے ہیں۔

میں نے پوچھا "حضرت مولانا کیا ان دنوں شعر بھی نازل ہوتا ہے؟" فرمانے لگے "روح القدس نے مدت سے رُخ نہیں کیا۔" **

ظفر علی خاں

(از، مولانا حالی مرحوم)

اے مالکِ دفترِ زمیندار
اے نازشِ قوم فخرِ اقراں

اے روحِ روانِ جمعِ احباب
اے چشم و چراغِ بزمِ اخواں

اے دین کے امتحاں میں جاں باز
اے نصرتِ حق میں تیغ عریاں

اے صدق و صفا کی زندہ تصویر
اے شیر دل اے ظفر علی خاں

بلقان و طرابلس میں ناگاہ
اٹھا ستم و جدل کا طوفاں

ہمدردیٔ اہلِ دیں سے آخر
جوہر ترے کر دئے نمایاں

جمعیتِ دہر کو سراسر
دامن ہوا چاک تا گریباں

پھیلے وہ بہ شکلِ سیلِ آتش
دل میں ترے جو شرر تھے پنہاں

غالا یہ تری پکار نے غُل
جی اٹھے وہ مردے جو تھے بے جاں

جو دل غمِ قوم سے تھے بے حس
چلنے لگیں ان دلوں میں چھریاں

ہاں اس میں نہیں مبالغہ کچھ
سنتا بھی ہے اے ظفر علی خاں

نازاں ہے وہ درسگاہ تجھ پر
تعلیم پہ جس کی تو ہے نازاں

کاش ایسے بنے وہاں فرزند
جو قوم کے درد کے ہوں درماں

سوزِ غمِ دینِ حق سے جن کے
سینے ہوں کباب دل ہوں بریاں

جو ملک و وطن کے ہوں فدائی
جو قوم کے نام پر ہوں قرباں

پنجاب کو تجھ پہ ہو اگر فخر
ہے اس کو فخر و ناز شایاں

زندہ ہے وہ ملک اور ملت
ہوں زندہ دل ایسے جس میں انساں

قلمی چہرہ

- بھاری قد
- گندمی رنگ
- بھرپور بدن
- آنکھیں روشن اور متحرک اور بارعب
- بولنے میں روانی اور بے باکی
- ورزش کے شوقین
- مسلم راجپوت

علی گڑھ کے بی۔ اے اخبار زمیندار کے وارث (کیونکہ ان کے والد مرحوم (منشی سراج الدین) نے جاری کیا تھا) پنجاب کے رہنے والے، غیر مقلد یعنی وہابی عقیدہ رکھتے ہیں۔ عربی فارسی انگریزی اور اردو کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ نظم و نثر لکھنے میں پنجاب کے پانچوں دریاؤں سے زیادہ رواں ہیں۔ قادر الکلام ہیں، لیکن قادر المزاج نہیں۔ بھبک سے اڑ جانے والی انسانی بارود ہیں۔

ان کی بول چال میں لہجہ اور تحریر میں پنجابی اثر بالکل نہیں ہوتا مگر ان کی اردو عرب سے چھن کر آتی ہے اور فارس کے راستے یہاں پہنچتی ہے، بہت خوب لکھتے ہیں۔ ترجمہ کرنے میں ان کی برابری کوئی نہیں کر سکتا۔ قادیانی ہوتے تو اپنی بے نظیر اور دل و دماغ پر نقش ہو جانے والی نظموں کو وحی و الہام کہتے، ہندو ہوتے تو کسی بچے کو گنجوں نہ رہنے دیتے۔

انگریز ہوتے تو شاہ خرچی سے برٹش قوم کا دیوالہ نکال دیتے قیامت کے دن اپنی پاک نظموں کے سبب بخشے جائیں گے اور ہندوستان میں "زمیندار" کی قربانیوں کے طفیل آئندہ نسلوں کے لئے ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

(خواجہ حسن نظامی دہلوی مرحوم)

** چودھری غلام حیدر خاں صاحب نے مجھے بتایا کہ مولانا لکھنے پڑھنے کا شغل مدت سے ترک کر چکے ہیں۔ میں صرف عادتاً انھیں اخبارات پڑھ کر سنا دیا کرتا ہوں۔

اردو دنیا

پاکستان اور تمثیل کانفرنس

پاکستان میں پہلی مرتبہ اور تمثیل کانفرنس ۲۸، ۲۹ دسمبر کو ہو رہی ہے۔ ہندوستان کے ادیبوں اور فاضلوں کو بھی دعوت نامے بھیجے گئے ہیں اور اس اجتماع کے لئے خاص انتظامات ہو رہے ہیں۔

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو پروفیسر آل احمد سرور کو بھی دعوتی خط اور تار آئے تھے مگر ہندوستان کی ایشیائی کانفرنس اور دیگر مصروفیتوں کی وجہ سے موصوف نے بہت افسوس کے ساتھ معذرت کی ہے۔

انجمن شعور ادب

مشہور افسانہ نگار سید علی عباس حسینی شاہجہانپور آئے۔ ان کے اعزاز میں جناب شاہجہاں پوری نے ایک عصرانہ دیا اور انجمن شعور ادب کی طرف سے ایک ادبی جلسہ دل شاہجہاں پوری کی صدارت میں اختر تہری کے مکان پر ہوا۔ اختر تہری کے افسانے سے جلسے کا آغاز ہوا اس کے بعد اختر تہری نے ایک طنزیہ مضمون "خود ستائی کی ورزش" پڑھا۔ اس مضمون کے بعد حسینی صاحب نے "آنسوؤں کا ہار" ایک ادبی مضمون پڑھا۔ اس کے بعد مقامی شعراء نے اپنے طرحی کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

ہائی کورٹ میں اردو داں جج

مدراس ہائی کورٹ میں اردو جاننے والے ایک جج کا تقرر حکومت کے زیر غور ہے۔ یہ بات وزیر مال مسٹر ناگوڑ نے ارکان اسمبلی کی کانفرنس میں اس وقت بتائی جب ان کی توجہ ایک رکن نے مجلس سے تعلق رکھنے والے چار ہزار مقدموں کی طرف دلائی جن کا پورا ریکارڈ اردو میں ہے۔

بزم مشاعرہ

افریدی ٹاک، رحمانیہ کالج اور دبیرپور) میں ٹورنامنٹ کے خاتمہ پر ایک شاندار بزم مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ جس میں مقامی اور بیرونی شعراء نے حصہ لیا۔ مشاعرہ سید اطہر حسن صاحب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی صدارت میں ہوا جس میں سپرنٹنڈنٹ پولیس اور دبیرپور اور باندہ کی بے شمار معزز ہستیاں شریک ہوئیں۔ شعراء میں جناب فنا نظامی، جناب ہادی، جناب جتر باندوی کے نام قابل ذکر ہیں۔

حلقہ دانشوراں بھوپال

پروفیسر ست پرکاش سنگر کے مکان پر ہندوستان کے مشہور افسانہ نگار مسٹر رام لال کی صدارت میں حلقہ دانشوراں کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا جس میں کوثر چاندپوری، ست پرکاش سنگر، شفا گوالیاری، ابراہیم یوسف، ارشد صدیقی ساگری شہاب اشرف، عزیز گوالیاری، پروفیسر مکند ترپاٹھی، ڈاکٹر ماتھر، شری ماتھر، ماشور شرا۔ اور کرشن دبیر جوشی وغیرہ نے شرکت کی۔ سب سے پہلے کوثر چاندپوری نے رام لال صاحب کا مفصل تعارف کرایا۔ جنہوں نے حلقہ دانشوراں میں اپنی شرکت پر اظہار مسرت کیا۔ ارشد صدیقی نے گزشتہ جلسے کی کارروائی سنائی۔ تنقیدی پروگرام میں مختلف احباب نے حصہ لیا۔ آخر میں صدر نے اپنی صدارتی تقریر میں حلقہ دانشوراں میں کی جانے والی بحث کو سراہا اور کہا کہ اس حلقے میں بہت صحت مند تنقید کی جاتی ہے اور بحث کا طریقہ بھی بہت خوبصورت ہے جس سے کسی قسم کی تلخی پیدا نہیں ہوتی۔

مجاز کی یاد میں مشاعرہ

۵، دسمبر کو مجاز میموریل کمیٹی کی جانب سے اسٹریچی ہال میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے کی صدارت پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے فرمائی۔

حسب ذیل شعراء نے مشاعرے میں شرکت فرمائی اور اپنا کلام سنایا۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں، پروفیسر آل احمد سرور، خلیل الرحمن اعظمی شہاب جعفری، عثمان انصاری، سید امین اشرف، ڈاکٹر منیب الرحمن تاباں (مہمان) وغیرہ

علی گڑھ میں یوم مجاز

(نامہ نگار)

۲۰، دسمبر ۱۹۵۶ء کو یوم مجاز کی تقریب کے سلسلے میں مجاز میموریل کمیٹی کی طرف سے مسلم یونیورسٹی یونین ہال میں ایک جلسہ ہوا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے جلسے کی صدارت فرمائی۔ سب سے پہلے شہاب جعفری کی بنائی ہوئی مجاز کی تصویر کی نقاب کشائی کی گئی۔

جلسے کی کارروائی مجاز کی نظم "نذر علی گڑھ" سے شروع ہوئی جسے اشتیاق محمد خاں کی قیادت میں مسلم یونیورسٹی اسکول کے طلبا اور گرلز کالج کی طالبات نے ترانے کی شکل میں پیش کیا۔

مجاز کی ہمشیرہ محترمہ حمیدہ سالم صاحبہ نے مجاز کی یاد میں اپنا مقالہ پڑھ کر سنایا جس میں بہن کا تاثر بدرجہ اتم تھا۔ حاضرین جلسہ بہت متاثر ہوئے۔ حمیدہ سالم صاحبہ کے مقالے کے بعد جناب شہاب جعفری جناب قمر رئیس اور محترمہ شہناز ہاشمی صاحبہ کے مقالے تھے۔ جس نے حاضرین کے دل میں مجاز کی شخصی اور فنی خوبیوں کو اجاگر کیا۔ ہر مقالے کے درمیان میں اشتیاق محمد خاں صاحب، باقر مجتبیٰ، بشیر حسن زیدی اور رئیس احمد صاحب نے مجاز کی غزلیں سنائیں۔

اس کے بعد جناب صدر نے پروفیسر آل احمد سرور سے تقریر کی فرمائش کی۔ سرور صاحب نے اپنی تقریر کے دوران میں فرمایا کہ اگرچہ مجاز نے بہت زیادہ شعر نہیں کہے۔ لیکن ان کی شاعری سنگ میل کی حیثیت

رکھتی ہے۔ ان کے یہاں رومان بھی ہے اور انقلاب بھی ہے اور اس کے پیچھے ایک سماجی انسان چھپا ہوا ہے۔ ان کی رومانیت، انقلابی تصویر سے توانائی حاصل کرتی ہے۔ مجاز پوری نسل کی ترجمانی کرتے ہیں اور اسی لئے ان کا المیہ پوری نسل کا المیہ ہے مجاز نے کسی حال میں بھی زندگی کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور یہی وجہ ہے کہ ناکامی کے باوجود ان کی شاعری میں احساس ناکامی نہیں ہے ؎

یہ اپنا میل غم و سیل حوادث
سراسر ہے کتاب بھی ختم نہیں ہے

یہ لہجہ مجاز کی عظمت کا آئینہ دار ہے۔

آخر میں سیّد صاحب نے فرمایا کہ مجاز کی موت مخصوص سماجی حالات میں ہوئی۔ اور ہم اگر ان حالات کو بدل دیں تو اب بھی بہت سے مجازوں کو موت کے منھ سے بچا سکتے ہیں۔

آخر میں جناب صدر نے مجاز سے متعلق چند باتیں کہہ کر جلسہ برخاست کیا۔ (نامہ نگار)

مجاز —— جگر کی نظر میں

لکھنؤ میں یوم مجاز کے مشاعرے کی صدارت جناب جگرؔ صاحب نے قبول فرمائی تھی۔ علالت کی وجہ سے جلسہ میں تشریف نہ لے جا سکے۔ ان کا خطبۂ صدارت دانش صدیقی صاحب نے پڑھا، جس کا ایک ٹکڑا روزنامہ قومی آواز کے شکریے کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔

(ہماری زبان)

مجاز مرحوم کی زندگی میرے سامنے اکثر کھلی کتاب کی طرح آتی رہی ہے۔ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی حیرت انگیز ترقی اور شاعری میں اپنی قدرتی صلاحیتوں کا سکہ سارے ہندوستان و پاکستان پر بٹھا دیا تھا۔

ایک مختصر سے عرصے میں ان کی منفرد آواز اور بھرپور لہجے نے ساری ادبی دنیا کو اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔ انھوں نے اردو شاعری میں بہت سے نئے خیالات اور جذبات کا اضافہ کیا۔ ایک نئی لے اور ترنگ کے ساتھ انھوں نے شباب اور انقلاب کا ایک ایسا حسین امتزاج پیش کیا جو اس وقت کے ادب کے لئے بالکل اچھوتی اور نئی چیز تھی۔

وہ نئے ادب کے معماروں اور ہندوستان کے ترقی پسند تحریک کے علمبرداروں میں سے ایک تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے غزل کے لب و لہجہ اور ٹکنیک میں کسی تبدیلی کو گوارا نہیں کیا۔ ان کی شاعری شروع سے آخر تک ایک نیا تجربہ ہے لیکن ساخت اور ہیئت کے اعتبار سے انھوں نے قدیم روایتوں سے انحراف نہیں کیا بلکہ بڑی محبت اور صدق دل کے ساتھ ان کا ساتھ دیا۔ انھوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان نظموں میں ان کے جذبات کی شدت، لہجہ کی بے ساختگی، طرز ادا کا بانکپن، الفاظ کا انتخاب

اسلوب کی شگفتگی اور زندگی کے شعور سے بخوبی احساس کیا جا سکتا ہے کہ وہ جدید ہوتے ہوئے بھی قدیم اقدار سے ہم آہنگ تھے ان کی نظموں میں جدت ہے جوش اور ولولہ ہے۔ زمانے پر چوٹیں ہیں پھبتیاں ہیں ہیں اس کی بے رخی اور سفاکی کے شکوے ہیں اور بہت بھیانک اور دہشتناک احساس ہے لیکن وہ زمانے کے سامنے بے بس نہیں ہوئے۔ موقع پرستوں کے ساتھ انھوں نے مفاہمت گوارا نہیں کی بلکہ زندگی کی مسلسل بربادیوں اور پیہم شکستوں نے ان کے کردار میں شرافت نفس اور بالغ النظری کا ایک ایسا کرب مسلسل پیدا کر دیا جس میں تخریب کا سوز بھی ہے اور تعمیر کا ساز بھی ہے۔

بمبئی میں اردو

الفاروق کامٹی کی اطلاع ہے:

بمبئی کی حکومت نے مرکزی حکومت سے کہہ کر (کیونکہ پوسٹ آفس مرکز کے تحت ہیں) یہ ضروری قرار دیا ہے کہ ہر پوسٹ کے ہرکارے (ڈاکیہ) کو اردو کا جاننا ضروری ہے۔ چنانچہ بمبئی علاقے کے ڈاک کے دفتروں میں اردو کے تختے آویزاں ہیں۔ جہاں کچھ وقت ڈاکیہ مرہٹی یا ہندی کی مدد سے اردو سیکھتا ہے۔ اکثر خطوط پر اردو میں پتے لکھے ہوتے ہیں جن کو بغیر کسی دقت کے مرسل علیہ تک پہنچانے کے لئے ڈاکیوں کو اردو کی شدبد ہونی چاہئے۔ ایک عوامی اور غیر مذہبی ایسی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ اس بات کو دیکھے کہ اس کے کارکن اپنی خدمات کو خوش اسلوبی سے انجام دے کر اپنے شہریوں کو سہولت پہنچاتے ہیں یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ کم اردو خواں طبقہ کی سہولت یہی ہے کہ ان کے خطوط بلا کسی تاخیر کے پہنچ جایا کریں اور یہ کام اس وقت تک خوش اسلوبی سے انجام نہیں پا سکتا جب تک کہ ڈاکیے اردو خواں نہ ہوں۔ ہم محکمہ تار کو اس کے اس اقدام پر دلی مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ بھارت کی ہر ریاست کی تقلید میں اردو داں ڈاکیوں کے رکھنے پر بھی زور دے گی۔

بقیہ تبصرہ

میں حل لغات اور عشق، گرامر کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ ان کتابچوں میں اس لئے پہلے حصے میں حل لغات سرے سے ہے ہی نہیں۔ دوسرے میں ہے، مگر کوئی تدریجی سی چیز کی گئی محض ترجمے یا تفسیر کر دینا صحیح طریق تعلیم نہیں ہے۔ علاوہ بریں مولف نے کہیں کہیں صرف تفسیر سے بھی کام لیا ہے مثلاً خاشق اور فعاملات کی تشریح میں (ص ۱۲)۔ یا حصہ کی تشریح کرتے ہوئے تیمور سنی مجتہد، حنفی وہابی فرقے، رضاخانی، دیوبندی اور بریلوی فرقے کا ذکر چھیڑ کر (ص ۷)۔ شاید ان کا خیال ذوق کے اس شعر کی طرف منتقل ہوا ہو

جتا دو دو فرقے حد کے حد سے ہیں   رہنا ہے طریق کہ خالی حد سے ہیں

تاہم یہ اختلافی بحث تفسیر میں نہ آتی تو اچھا تھا۔ اس حصے کی بعض خوشگوار تشبیہیں ہیں اس کے علاوہ اغلاط کتابت بھی ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ اڈیشن میں ان کا خیال رکھا جائے گا۔ بہر حال علاقہ بمبئی میں یہ اقدام بسا غنیمت اور مستحق ہمت افزائی ہے۔

تبصرے

(ضیاء احمد بدایونی)

وجدانِ حافظ

ایک زبان سے دوسری میں ترجمہ کرنا بظاہر معمولی بات ہے، مگر دراصل بڑا دشوار گزار مرحلہ ہے۔ جب تک کوئی شخص دونوں زبانوں کا ادا شناس نہ ہو اس کٹھن فرض سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے خصوصاً جب کہ کتاب زیرِ ترجمہ کوئی بلند پایہ ادبی شاہکار ہو اور ترجمہ بھی منظوم ہو، یہی وجہ ہے کہ ہماری زبان میں اعلیٰ مصنفات تو منتقل ہوئیں مگر اعلیٰ مترجم کم۔ یہ خوشی کا مقام ہے کہ منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی اردو میں ایک کامیاب مترجم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اس سے پہلے بھگوت گیتا۔ گمار سمبھو۔ رگھوبنس کا منظوم ترجمہ کرچکے ہیں۔ وہ لکھنوی ہونے کی بنا پر زبان کا رچا ہوا مذاق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا ادبی ذوق بہت بلند ہے جو ان کو اپنے والد سے ورثہ میں ملا ہے۔ زیرِ نظر کتاب وجدانِ حافظ اردو منظوم ترجمہ ہے عرفانِ حافظ کا جو حافظ کے منتخب اشعار کا مجموعہ ہے۔ منور صاحب نے ہر جگہ لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے اور ایسا کرنا چاہیے بھی نہ تھا۔ انھوں نے اکثر حافظ کے مفہوم کو پیش کیا ہے اور محاورے کے اصرف اور زبان کی صفائی کو مدِ نظر رکھا ہے۔ دو تین نمونے ملاحظہ ہوں۔

حافظ: فرازِ منبر و حقیقت شود پدید — شرمندہ رہروے کہ نظر بر مجاز کرد
منور: حقیقت باطنی کا جلوہ کبھی بھی جب آشکارا ہوگا — مجاز پر ہے نگاہ جس کی وہ راہرو شرمسار ہوگا (ص ۱۱)

حافظ: بہائے وصل تو گر جاں بود خریدارم — کہ جنس خوب محقر بہ ہر چہ دید خرید
منور: میں اپنی جان دیکر بھی ترے قرب کا طالب ہوں — تلاوت تو لے لیتے ہیں ہر قیمت پہ چیز اچھی (ص ۷۰)

حافظ: تو بندگی چو گدایاں بہ شرطِ مزد مکن — کہ دوست خود روشِ بندہ پروری داند
منور: بھکاری کی طرح شرط جزا پر بندگی کیسی — طریقہ جانتا ہے دوست خود بندہ نوازی کا (ص ۹۲)

البتہ کہیں کہیں ترجمہ بہت سپاٹ اور بے لطف ہوگیا ہے۔ مثلاً

حافظ: گر چہ می گفت کہ زارت بکشم می دیدم — کہ نہانش نظرے با من دل سوختہ بود
منور: زباں پر تھی بظاہر یوں تو دھمکی قتل کی دیکھی — نظر چپ چپ کے تکتی پر بھی دیکھے جو دیکھی (ص ۴۴)

حافظ: من ہمانم کہ وضو ساختم از چشمہ عشق — چار تکبیر زدم یکسرہ بر ہر چہ کہ ہست
منور: دھوئے ہیں جب سے چشمۂ الفت میں ہاتھ پاؤں — پڑھتے پہ بھیجتا ہوں میں لعنت ہزار بار (ص ۴۰)

ہمارا خیال ہے کہ بعض مواقع پر ادائے مفہوم میں مترجم سے لغزش ہوگئی ہے جیسے:۔

حافظ: بہوا کس را کہ مزخرف عشق و شہر یار نیست — چہرۂ تو بر آتش نہ کہ داری کار و بار خوش
منور: جو عشق دلبر میں بار پانے کا اسکو شیشۂ نصیب ہوگا — سیاہ تو آگ پر رکھے کہ جس کے کار و بار اچھے (ص ۴)

عشق میں بار ہونا اور بار پانے میں بڑا فرق ہے۔ پھر حافظ یہ نہیں کہتے کہ وہ سپاہ تو آگ پر رکھے تاکہ اس کا کاروبار چلے۔ تل رکھنے اور کاروبار چلنے میں کوئی نسبت نہیں ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ تیرا کام خوب چل رہا ہے دفعِ نظر بد کے لئے آگ پر کالا دانہ رکھ۔

یا بکشش دشواریِ منزل بہ یادِ عہدِ آسانی کا ترجمہ راہ منزل کی دشواری کو آسانی کا دور آئے۔ ص ۸۰ بالکل غلط ہے۔ مراد یہ ہے کہ جو اچھے دن گزرے ہیں ان کی یاد میں دشواریاں برداشت کر۔ اسی طرح فرض ایزد بگزاریم میں نگزاریم ہے، کو ترجمہ "کریں ادا فرضِ ایزدی ہم" (ص ۸۱) صحیح قرأت اور نیز تحاتِ کلام کے خلاف ہے۔ تل بنماس ہو اپر زہد ہم مغرور شس کا ترجمہ زہد و تقویٰ سے ہاتھ اٹھانا، بالکل برعکس ہوگیا۔ زہد مغرورشس سے مراد یہ ہے کہ زہد و تقویٰ پر ناز یا اس کی نمائش نہ کرنا۔

علاوہ بریں بعض جگہ سہوِ کتابت بھی ہے امید ہے کہ آئندہ تصحیح کردی جائے گی۔

ان جزوی مسامحات کے باوجود کتاب قابلِ قدر اور کوشش لائقِ تحسین ہے۔ منور صاحب اردو کی خدمت کرنے اور اس کے ذخیرے کو مالا مال کرنے میں لگے رہتے ہیں اور یہ ایسا وصف ہے جس کی تعریف نہ کرنا حق پوشی ہوگی۔

آسان درسِ قرآن حصہ اول و دوم

مولفہ: حافظ محمد یعقوب پیش امام مسجد نیا بازار کامٹی
قیمت ۱/۵۰ روپیہ و ۲/۰۰ روپے۔ ملنے کا پتہ: الفاروق بک ڈپو۔ کامٹی (ضلع ناگپور)

قرآن مجید تمام مسلمانوں بلکہ انسانوں کے لئے دینی اور دنیاوی فلاح و نجات کا جامع دستور العمل ہے لیکن کتنے لوگ ہیں جو اس کو پڑھتے ہیں یا پڑھ کر سمجھتے اور عمل پیرا ہوتے ہیں۔

از تلاوت بر تو حق دارد کتاب — تو از و کامے کہ می خواہی بیاب
گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

یہ ضرورت ہر زمانے سے زیادہ آج محسوس ہو رہی ہے کیونکہ ہماری سیکولر حکومت کا نظام ایسا ہے کہ ڈر ہے کہ آئندہ مسلمان نسلیں نہ صرف قرآن سے بلکہ اپنی زبان سے بھی جس میں ہماری تہذیب، ادب اور مذہب کا بڑا سرمایہ محفوظ ہے یکسر بیگانہ ہوں گی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے بہت سے درد مند اصحاب نے اس کی کوشش کی ہے کہ مسلمان بچے ابتدائی مذہبی تعلیم اور معمولی اردو نوشت و خواند سے آشنا ہو سکیں۔ چنانچہ ہمارے صوبہ یوپی میں مولانا محفوظ الرحمن صاحب نامی کی مفتاح القرآن (۵ حصے) اور دہلی میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کے رسالے تعلیم الاسلام اسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ زیرِ نظر دو کتابیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور لائقِ قدر کتابیں ہیں۔

راہ تو بہ ہر قدم کہ پویند خوش است — نام تو بہ ہر زباں کہ گویند خوش است

مولف نے قرآن پاک کی چند چھوٹی چھوٹی سورتیں جو بیشتر نماز میں پڑھی جاتی ہیں لیکر بین السطور ترجمہ دے دیا ہے اور ہر ایک کے آخر میں تفہیم کے عنوان سے ان کی تفسیر اور تشریح کی ہے کسی نئی زبان کو سیکھنے کے لئے معلوم سے نامعلوم تک پہونچنے کے تدریجی اسباق ضروری ہیں اس سلسلے

مراسلات

"اردو شاعروں اور ادیبوں سے"

محترمی! تسلیم!

ہماری زبان مورخہ ۸، دسمبر ۱۹۷۴ کے مراسلات میں گوپی چند نارنگ صاحب کا مراسلہ نظر نواز ہوا۔ مجھے جناب نارنگ کے خیالات سے مکمل اتفاق تو نہیں پھر بھی میں ان کے نیک مقصد کی مدح کا بھنوا ضرور ہوں۔ جہاں تک مذکورہ مراسلے کے تیسری پہلو کا تعلق ہے میں اپنے ہمزبان ادیبوں سے اور زیادہ بھرپور اور پرخلوص ہندوستانیت کو اپنے ادب میں پیدا کرنے کا تقاضا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہرچند کہ اردو کی اپنی ملی اور قومی جذبات کی ترجمانی پر شک کرنا یا اس کی ہندوستانیت کو مشتبہ سمجھنا کفر ہے لیکن اردو کے بے شمار ادیبوں کی اپنے وطن کی قومی ثقافتی اور فنی روایات بیگانگی کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ دور حاضر کے اکثر ہندوستانی ادیب یا تو فارسی و حجاز کے باشندے نظر آتے ہیں یا مغربی۔ سیاسی اور نفسیاتی نظریات اور جمالیاتی مفروضات کے اندھے مقلد۔ یوں تو ہندی ادیبوں کے ایک مختصر اور اہم گروہ کے مقابلے میں مغربی فارموں اور نظریات فکر و فن کی اندھی تقلید اور مقلدانہ نقالی اردو ادیبوں میں کم نظر آتی ہے لیکن پھر بھی ہماری آفاقیت اور ہمہ گیری کا جذباتی سیلاب ہمیں اپنی قومی روایات سے اس قدر قریب نہیں رکھ سکا جتنے ہندوستانی کی دوسری زبانوں کے ادیب ہیں جس طرح ہندی ادیبوں کی اکثریت ہندوستان کی تاریخ کے ازمنہ وسطیٰ اور دور جدید کے حصۂ خاص سے متعصبانہ سلوک روا رکھتی ہے اسی طرح اردو ادیب دو چار معزز و مقبول شخصیتوں کی قصیدہ خوانی سے قطع نظر اپنی تاریخ کے عہد قدیم سے کوئی عرفان یا استفادہ حاصل نہیں کرتے۔

آپ ہی فرمائیے کہ ہم میں اتنے کتنے ہیں جو بھرت منی بھرت ونشی۔ بھاسہ، ابھینو ناتھ، کنتک، وامن، رودرٹ، اپی تو، بھوج راج وغیرہ کے شعری نظریات اور جمالیاتی نقطہ نگاہ سے آگاہ ہیں۔ ہم میں سے ایسے کتنے ہیں جنہیں بدھ، مہاویر، شنکر آچاریہ وغیرہ کے افکار عالیہ کا علم ہے یا ہم میں سے ایسے کتنے ہیں جنہیں اپنی تہذیبی اور تمدنی تاریخ کا مسلسل وار شعور ہے اور جو اپنی فنی روایات سے اتنے ہی واقف ہیں جتنے کہ مغربی رومانیت اور فرائیڈیت اور تاثریت سے۔

یہ تو خیر ماضی کی بات ہوئی۔ ہماری اپنی نظروں کے سامنے ہندوستان کا نقشہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ بتائیے کہ ہم نے کیا واقعی ان تاریخ ساز تبدیلیوں اور عالمگیر اثرات رکھنے والے عظیم حقائق کا پرخلوص ادراک کیا ہے اور اس ادراک کو احساسات اور تاثرات جذبات کی زبان سے بیان کیا ہے۔ ہندوستانی ادب کے تین تعمیری رنگ بنیاد ہیں۔ ستیم (حقیقت)، شیوم (خیر) اور سندرم (حسن)، جب ہمارا ادب ان عناصر ثلاثہ کا موزوں اور متناسب احاطہ نہیں کرتا اور ان کے سبھی پہلوؤں کو اجاگر نہیں کرتا۔ ہم اپنے ادب کو مکمل نہیں کہہ سکتے۔ اب تک ہم نے ادب کو زیادہ تر تنقید حیات کا روپ بنا رکھا ہے۔ ادب تعمیر حیات ہے اور عکاس حقائق بھی۔ اس حقیقت کو اکثر نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہم اپنے ادب کی آفاقیت اور کائناتی ہمہ گیری کو قائم رکھتے ہوئے اپنے ماضی حال اور مستقبل سے شعور اور عرفان حاصل کریں اور اپنے وطنی اور قومی اقدار کو خون جگر میں رنگ کر اپنے ادب میں رچائیں بسائیں اور سجائیں۔ ہمارا ادیب انسانی ہوتے ہوئے بھی ہندوستانی ہو، ہندوستانی رہتے ہوئے بھی انسانی ہو اور ہندوستانی اور انسانی رہتے ہوئے بھی اردو ادیب بنا رہے۔

ایسا کرنے میں آسانی پیدا کرنے اور سہولت بہم پہنچانے کی غرض سے انجمن ترقی اردو ہند اور دیگر ناشران کرام فن ادب دیگر فنون لطیفہ سے متعلق قدیم تصانیف کے تراجم شائع کرنے کا کریں تو بہتر ہوگا۔ اس سلسلے کے مضامین اردو رسائل میں شائع ہو کر بڑا کام ہو سکتا ہے۔ اسی طرح سنسکرت کے علمائے کرام کے نظریات شعر و ادب پر تقریری پروگرام بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ ہمارے بعض شعرائے اور بعض محققین نے اس میدان میں مستحسن خدمت انجام دی ہے لیکن بہت ناکافی۔

ہم نے بیرونی ممالک روس، فرانس اور انگلینڈ وغیرہ کے فنی اقدار کو اپنا کر ہندوستان کی تہذیبی تاریخ میں گرانقدر اضافہ ضرور کیا ہے لیکن اپنی قدیم قومی روایات سے اور اپنی جدید ترقیوں اور کوششوں سے ہماری بیگانہ روی کسی طرح لائق تحسین قرار نہیں دی جا سکتی۔

نیاز کیش

عبدالعزیز عتیق حنفی۔ ایم۔ اے

اردو فیسٹول

مکرمی۔ تسلیم!

عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا گزشتہ دو سالوں سے شاندار پیمانے پر بین کلیاتی اردو فیسٹول منا رہے ہیں گزشتہ سال ہزایکسلنسی جی رام کرشنا راؤ گورنر کیرالا نے فیسٹول کا افتتاح فرماتے ہوئے اسے طلبا کی اچھی تہذیبی روایات قرار دیا تھا۔ اس سال طلبہ ایک نئے ماحول میں زیادہ عظیم پیمانے پر ۲۹، ۳۰ جنوری ۱۹۷۵ کو اردو فیسٹول منا رہے ہیں فیسٹول کے افتتاح کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد سے درخواست کی جا رہی ہے۔ نیز ہندوستان بھر کے چوٹی کے شعرا اور ادیب مدعو کئے جا رہے ہیں۔ یہ ہندوستان بھر میں اپنی نوعیت کا انفرادی فیسٹول ہے جو حیدرآباد و سکندرآباد کے ۲۵ سے زائد کالجوں کے اشتراک سے منایا جاتا ہے۔ اس سمپوزیم کا موضوع "لسانی ریاستوں میں اردو کے مسائل ہے" ایک کل ہند مشاعرہ بھی اس موقع پر ہوگا۔

سید حسن (معتمد اردو فیسٹول)

معاصرین

(بہ سلسلہ گزشتہ)

(ادارہ نیا دور لکھنؤ)

سرور نے یہ بھی پتے کی بات کہی ہے کہ "شاعر خوابوں کے ذریعے حقائق کی توسیع کرتا ہے۔" شاعری نہ صرف خواب ہے نہ کوری حقیقت، اجلی دھال کے چہرے پر نظریں جمائے رکھنے والا شاعر ایک بے بس تماشائی بننے پر مجبور نہیں ہے، وہ الجھنوں اور پریشانیوں کے ہجوم میں گھرے رہنے مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں نور امید کی رینگتی ہوئی کرنیں بھی دیکھ لیتا ہے اور پھر اسی کرن کے سہارے اندھیرے گوشوں کو جگمگا کر رنگین محفلیں برپا کر دیتا ہے کہ بجھے ہوئے دل آمادۂ عمل ہو جاتے ہیں، زندگی جھجکتی اور ٹھوکریں کھاتے کھاتے ایک نئے راستے پر ہو لیتی ہے حقیقت کا قریب ترین جائزہ لینے کے بعد مستقبل کا جو خواب شاعر کو آمادۂ عمل کرتا ہے، اسی کو سرور نے حقیقت کی حدوں کی توسیع کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ خواب حقیقت سے بھی کچھ بڑھ کر حقیقت کی حدیں بڑھاتا ہے۔ یعنی ادب حقیقت کی بے جان نقل ہی نہیں ہے بلکہ حقیقت کو سنوارنے اور بدلنے کا ایک تخلیقی عمل بھی ہے۔ اس تخلیقی عمل کو صرف سود و زیاں کے سستے پیمانوں سے کیسے ناپ سکتے ہیں؟ خوف سود و زیاں تو اکثر خوابوں کو منتشر کر دیتا ہے۔

آل احمد سرور "ترقی پسند" ناقدین میں ایک بلند درجے کے مالک ہیں اور اس حلقہ ادب کے سب سے نمایاں ترجمان ہیں۔ انھوں نے گزشتہ بے راہ روی کے خلاف یہ آواز اٹھا کر ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ بالخصوص ان کا یہ اعلان کہ "شاعری کو نعرہ بازی یا پروپیگنڈے کی ضرورت نہیں ہے۔" بہت ہی برمحل ہے۔ کافی دنوں تک نعرہ بازی کو ہی شاعری سمجھا جانے لگا تھا۔ وہ سبنھلا ہوا، نپا تلا، صاف ستھرا اور دل آویز انداز جو صدیوں کی تربیت و تہذیب نے شاعری اور ادب کو عطا کیا تھا جس سے زبان و ادب کی روایتوں کی تشکیل ہوئی تھی جو ہماری قومی ثقافت کا جزو بن گیا تھا اس سے کنارہ کشی کرکے نعرہ بازی کو ادب کا مترادف قرار دے لینا یقیناً اول درجے کی ناانصافی تھی۔ اس نعرہ بازی کا جواز یہ بتایا جاتا تھا کہ "عوامی ادب" پیدا کیا جا رہا ہے اس سے بڑی خود فریبی اور کیا ہو سکتی تھی۔ سرور نے ایسے حضرات کو بھی صاف صاف لفظوں میں آگاہ کر دیا ہے کہ متوسط طبقے کے شاعر اس (عوامی ادب) کے لئے فضا ساز گار کر سکتے ہیں، وہ خود عوامی ادب نہیں پیدا کر سکتے۔ کیونکہ جو چیز عوام کے دلوں کی گہرائیوں سے نکلے گی متوسط طبقے کے ہمدردوں کے ... سے نہیں۔

سرور نے شاعری کے بارے میں یہ مختصر بات کہہ دی ہے کہ "میں شاعری کو انسانیت کے ضمیر کی آواز سمجھتا ہوں۔ جب تک شاعری کا مطمح اتنا وسیع نہیں ہوگا، شاعری، شاعری نہیں بلکہ بازی گری رہے گی۔ حقیقی شاعری ہو یا رزمیہ، رومانی ہو یا سیاسی، مگر اس میں آفاقیت نہیں ہے اگر اس کا محور ساری انسانیت نہیں ہے تو وہ زیادہ دن تک نہیں چل سکتی۔ کاش ہمارے نعرہ ساز ادیب اور شاعر انسانیت کے ضمیر کی آواز کو سن سکیں۔ اور سرور ایسے عظیم المرتبت نقاد کی طرح لبیک کہتے ہوئے دوڑ سکیں۔

زندہ باد کے نعروں میں اردو کی موت

ہم عصر ریاست ہفتہ وار دہلی اردو کے متعلق کسی نہ کسی عنوان سے تقریباً ہر ہفتے کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہے۔ اس کے لکھنے کا جو کھرا اور بے جھجک انداز ہے وہ ریاست کے دیکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ اخبار مذکور نے ۱۵ دسمبر کے ادارتی نوٹ میں ادیپر کی ستی سے آندھرا کے وزیر تعلیمات کی اس شاندار تقریر کا اقتباس دیا ہے جس میں انھوں نے قدیم آندھرا سے آنے والوں کو اردو سیکھنے کی ترغیب دی ہے اور اس زبان کی خوبیاں اور پھیلاؤ کو بیان کرتے ہوئے اس کے سیکھنے کے فوائد بتائے ہیں۔ ہمیں ذاتی طور پر علم ہے کہ وزیر تعلیم آندھرا مسٹر ... بڑے اچھے کردار کے انسان ہیں۔ ان کا ظاہر و باطن ایک ہے وہ جو کہتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں۔

مگر یہ برابر دیکھا جا رہا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے رہنما اردو کے متعلق جتنا کہتے ہیں اتنا اثر متعلقہ لوگوں پر ہوتا نہیں۔ اگر ہوتا بھی ہے تو اتنا خفیف کہ عام نگاہوں کو محسوس نہیں ہوتا۔ اسی صورت حال سے متاثر ہو کر معاصر موصوف نے یہ ادارتی نوٹ لکھا ہے، یہ ایک عام بات ہے۔ اس کا روئے سخن کسی خاص شخصیت کی طرف نہیں ہے

(ہماری زبان)

ہندوستان میں اردو زبان کی کیفیت بھی بے حد دلچسپ ہے۔ یہ زبان ہندوستان کے کانسٹی ٹیوشن میں بطور ایک زبان کے موجود ہے ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت نہرو اپنی تقریروں میں اس کو تسلیم کرتے

اور اس کو ترقی دینے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ صوبہ جات کے وزرا اس کے حق میں بیانات دیتے رہتے ہیں اور ایک لیڈر بھی ایسا نہیں جس کو اس زبان کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت ہو مگر ان بیانات اور تقریروں کی موجودگی میں بھی کوئی صوبہ ایسا نہیں ہے جہاں کہ اس کو مٹانے اور اس کو موت کے گھاٹ اتارنے کی سرگرم کوششیں جاری نہ ہوں۔ چنانچہ پنجاب کی عدالتوں میں یہ زبان جاری تھی مگر اب اس کو وہاں سے نکالا جارہا ہے۔ پیپسو کے کروڑوں ہندو اور مسلمان یہ زبان بولتے ہیں مگر وہاں اس کو ایک علاقائی زبان نہ قرار دیا گیا۔ دہلی میں یہ پیدا ہوئی تھی اس صوبہ کے وزیراعلیٰ سردار گورمکھ نہال سنگھ یہاں وزارت اور اسمبلی کے کریاکرم کے ساتھ اس زبان کی بیسیں بھی پڑھ گئے اور حیدرآباد اور بھوپال اس زبان کے مراکز تھے۔ مگر وہاں بھی اس کی موت کے وارنٹ جاری ہوگئے۔ یعنی ہندوستان کے لیڈر اور وزراء اس کے حق میں زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے اس کو موت کے گھاٹ اتارتے چلے جارہے ہیں۔ اور کوئی نہیں پوچھتا کہ اگر تم اس زبان کو ملک میں سے ختم ہی کیا چاہتے ہو تو پھر اس کے حق میں بیانات کیوں دیتے ہو۔

اردو کی موجودہ حالت کو مرحوم سید اکبر الٰہ آبادی کے اس شعر سے مناسبت دی جاسکتی ہے۔ جو شعر آپ نے ۱۹۱۴ء کی جنگ کے زمانے میں انگریزوں کی فتح کی خبروں اور جرمن افواج کے میدان جنگ میں آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ یعنی اردو زبان کے حق میں یہاں زندہ باد کے نعرے بھی بلند ہوتے چلے جارہے ہیں اور اس زبان کا جنازہ بھی اٹھتا چلا جارہا ہے۔ کاش پنڈت نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد اپنی قوت آزادی سے کام لیتے ہوئے صوبہ جات کی گورنمنٹوں کو اردو دشمنی سے باز رہنے کے لئے مجبور کریں۔

(ریاست دہلی)

گرہیں مکتب ....

پچھلے ماہ کے اواخر میں ریاست بہار کی دونوں یونیورسٹیوں یعنی پٹنہ یونیورسٹی اور بہار یونیورسٹی کی اعلیٰ مجلسوں سینٹ کے جلسے ہوئے۔ بعض کمیٹیوں اور ذیلی شعبوں کی نشستیں کل پرسوں تک ہوتی رہیں۔ ہماری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی کہ وہی لوگ، جو جلسوں، مشاعروں بزموں اور پیٹ فارموں پر انصاف پسندی اور علم دوستی کا دم بھرتے ہیں جب علم کی حلقوں اور انتظامی مجلسوں میں بیٹھتے ہیں تو کسی پہلو سے آنکھیں بند کیوں کر لیتے ہیں۔ پہلو کیوں چرانے لگتے ہیں آج سے پانچ سات ماہ قبل بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا ایک وفد سٹی میں بہار یونیورسٹی کے وائس چانسلر شری شیام نندن سہائے سے ملا اور انہیں آگاہ کیا کہ بہار یونیورسٹی میں اکثر کالجوں میں اردو کی تعلیم کا نظم انتہائی ناقص ہے۔ موصوف نے خندہ پیشانی سے وفد کے جذبات کی قدر کا اظہار کیا اور دوسرے تیسرے دن ہی جنرل سکریٹری کو طلب کیا۔ جنرل سکریٹری ان سے تنہا ملے اور ان کے سامنے بعض ٹھوس حقائق رکھے اور عملی مثالیں دیں۔ وائس چانسلر نے ان کو کئی کالجوں کا نام لکھا دیا۔ اور یہ کہہ دیا کہ ان میں یا تو کوئی انتظام کردیا گیا ہے یا بہت جلد یعنی اسی سیشن کے شروع میں کردیا جائے گا۔ جب ... نظر پڑی اور ہماری توجہ مبذول کرائی گئی تو ہم نے سمجھا کہ ان ... بیشتر کالجوں میں اردو تعلیم کا کوئی نظم نہ تھا اور نہ اب تک ہے ... یاد دہانی کی غرض سے ایک لمبا اور طویل میمورنڈم بھیجا گیا ... کا بیان حکومت ہند کی وزارت تعلیمات اور یونیورسٹی گرانٹ ... بھی بھیجی گئیں۔ ان میں خود یونیورسٹی کیلنڈر کے حوالے سے و شمار دے کر یہ ثابت کیا گیا کہ بہار یونیورسٹی کے ۵۵ فی صدی کالجوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام نہایت ناقص ہے۔ کوئی بھی ماہر تعلیم اسے پسند نہ کرے گا کہ ایک لیکچرر ہفتہ میں ۴۰ کلاس لے۔ مگر بہار یونیورسٹی میں اردو کے کئی استاد اس پر مجبور کئے جاتے ہیں۔ اور جب انجمن ترقی اردو، استادوں، مسلم تنظیم اور اسی طرح کے وفود وائس چانسلر سے ملتے ہیں تو وعدہ تو کر دیا جاتا ہے مگر وہ وعدہ فردا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ خدایا! کیا تعلیم گاہوں میں بھی اب سیاسی کھیلوں کو اس حد تک دخل ہوگیا ہے۔

(سنگم پٹنہ)

پرنٹر و پبلشر اطہر پرویز نے نیشنل پرنٹرس کمپنی میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا